معرکہ بالاکوٹ کی شکست

عمر فاروق خاں

شاہ ولی اللہ صاحب کا جو زمانہ (۱۱۱۴ھ - ۱۱۷۶ھ) ہے اسی زمانہ میں جزیرہ عرب میں ایک اور اصلاحی تحریک وجود میں آئی۔ جس کے بانی شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی (۱۱۱۵ھ - ۱۲۰۶ھ) تھے [1] اس کے بعد افریقہ میں بھی اسی قسم کی ایک اصلاحی تحریک شروع ہوئی، جو سنوسی کے نام سے مشہور ہے۔ اور لیبیا میں آج اسی کے امام برسر اقتدار ہیں۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب کا انتقال ۱۷۹۲ء میں ہوا، اور سنوسی اعظم ۱۷۸۷ء میں پیدا ہوئے

---

[1] "فقہ و اعتقاد میں محمد بن عبدالوہابؒ نے امام ابن تیمیہؒ کے کتب و رسائل کا امعان نظر سے مطالعہ کیا انہوں نے امام صاحب کے افکار و دعوت کو سمجھا اور اپنا لیا۔ اور اس طرح اپنایا کہ پورے جوش و خروش کے ساتھ اس کی تبلیغ و اشاعت میں لگ گئے۔ اپنے حوالی موالی کو انہوں نے افکار ابن تیمیہؒ قبول کرنے کی دعوت دی۔ یہ دعوت کچھ ایسے اثر انگیز انداز میں دی کہ لوگوں نے دل کے کانوں سے سنی۔ رفتہ رفتہ بہت جلد ایک بڑا گروہ ایسا تیار ہو گیا جس کا مدار اعتقاد الکار ابن تیمیہؒ تھے۔ یہ لوگ محمد بن عبدالوہابؒ کے معین و مددگار اور یار و انصار بن گئے بلکہ ان لوگوں کی ایک چھوٹی سی مملکت بھی وجود میں آ گئی کیونکہ محمد بن عبدالوہاب کے زبردست حامیوں میں ان کے خسر محمد بن سعود بھی تھے، جو موجودہ مملکت سعودیہ کے جد اعلیٰ تھے۔"

حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ از پروفیسر محمد ابوزہرہ مصری (اردو ترجمہ)

یہ دور مسلمانوں کے لئے بڑا پُرفتن اور انحطاط کا تھا۔ برصغیر پاک و ہند میں مغل سلطنت اور اُدھر مغربی ایشیا میں ترکوں کی عثمانی سلطنت پوری طرح زوال کے نرغے میں آچکی تھی۔ ایک طرف ان پر یورپی قوموں کی یلغار جاری تھی اور وہ ان کے سامنے بُری طرح پسپا ہو رہی تھیں دوسری طرف شہنشاہی اور جاگیرداری نظام، جس پر ان سلطنتوں کی عالی شان عمارتیں کھڑی تھیں، بتدریج ٹوٹ رہا تھا۔ اور یورپ کی تجارتی معیشت جس نے بعد میں وہاں صنعتی انقلاب کی شکل اختیار کی، اور علاقائی قومیتوں کا پیدا کردہ استعماری سیلاب مشرق کی طرف بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ دنیائے اسلام کے ہاتھ سے مشرق و مغرب کی باہمی تجارت کی اجارہ داری چھن چکی تھی، اور اب پرتگالیوں، ولندیزیوں (ڈچ) فرانسیسیوں اور انگریزوں کے سمندری جہاز ساحل افریقہ کے گرد گھوم کر براہ راست ہندوستان، انڈونیشیا اور چین پہنچنے لگے تھے۔ اور وہ زمانہ ختم ہو چکا تھا جب پرتگالی ملاح واسکوڈاگاما کو بحر ہند میں ہر جگہ مسلمانوں ہی کے تجارتی جہاز اور ہندوستان سے لیکر چین تک ہر ساحلی مقام پر انہیں کی تجارتی کوٹھیاں نظر آئی تھیں، اس کے علاوہ اسی زمانے میں خود ان ملکوں کے اندر یورپی تاجروں کی آمد کی وجہ سے دولت و ثروت جاگیرداروں، زمینداروں اور دستی کام کرنیوالے کاریگروں سے جو زیادہ تر مسلمان تھے۔ ایک نئے طبقے میں جو اکثر غیر مسلم تھا بتدریج منتقل ہونی شروع ہو گئی۔ یہ طبقہ یورپی تاجروں اور مقامی زمینداروں اور کاریگروں کے درمیان واسطے کا کام کرتا تھا۔ ترکوں کی عثمانی سلطنت میں یہ یونانی، ارمنی اور یہودی تھے، اور برصغیر میں اکثر و بیشتر ہندو تھے چنانچہ برصغیر کی دیہی معیشت کی دولت کھنچ کر کلکتہ اور بمبئی کے راستے جب یورپ کی طرف جانے لگی، تو اس کا ایک حصہ اس نئے طبقے کو بھی ملنے لگا۔ اور یہ امیر سے امیر تر ہوتا گیا اس طرح یورپی تاجر اور اس کا یہ ہندوستانی غیر مسلم گماشتہ برصغیر کی معیشت پر بتدریج چھانے لگا۔ اس کے نتیجے میں یہاں مختلف گروہوں اور طبقوں میں، جو سیاسی توازن چلا آرہا تھا، وہ خلل پذیر ہونے لگا اور شمالی ہند اور وسط ہند کے شہروں کے بجائے کلکتہ اور بمبئی برصغیر کی سیاست و معیشت کے مرکزِ ثقل بن گئے

غرض جیسے جیسے مسلمانوں کے ہاتھ سے سیاسی اقتدار چھنتا گیا۔ اور ان کی نوابیوں کے ساتھ ساتھ ان کی سرداریاں اور جاگیرداریاں بھی ختم ہونی شروع ہوئیں تو ان سے متعلق ان کے جو فوجی طبقے تھے، وہ بے روزگار

ہونے لگے۔ اور ان پر کسب معاش کے دروازے بند ہوتے گئے۔ یہ تو اس برصغیر میں مسلمانوں کے حکمران اور ان سے تعلق رکھنے والے طبقات کا حال ہوا، لیکن مسلمانوں کے دست کار طبقے یورپی تاجروں کی آمد سے اور بھی زیادہ تباہ ہوئے۔ ان کی دستی صنعتیں یورپی مصنوعات کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اور کچھ تو اس مقابلہ کی وجہ سے اور کچھ سیاسی دباؤ کے ماتحت وہ بالکل اپاہج ہو کر رہ گئے اور یورپی تاجر اور غیر مسلم بنیا تمام آزاد پیشوں پر مسلط ہوتا گیا۔ سیاسی اقتدار سے محرومی اور اس معاشی زبوں حالی کے اثرات کا ان کے معاشرے پر پڑنا لازمی تھا چنانچہ اس میں پہلے جو خرابیاں تھی، وہ اور بڑھنے لگیں۔ غلط رسم و رواج میں اور اضافہ ہوا۔ اخلاقی نظم و ضبط کے بندھن ڈھیلے ہونے لگے۔ افراد کا کوئی عہدِ وفاداری نہ رہا۔ جماعت کا شیرازہ بڑی سرعت سے بکھرنے لگا۔ ذہن کا جمود، نظر کی تنگی اور عمل کی کوتاہی روز بروز زیادہ نمایاں ہونے لگی۔

یہ دور تھا، جس میں شاہ ولی اللہ کی تحریک اصلاح کا آغاز ہوتا ہے۔ اُس وقت مذہبی لحاظ سے مسلمان چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور بڑی شدت سے ایک دوسرے کی تکفیر میں منہمک تھے۔ علمائے امت کا زیادہ زور فروعات پر تھا۔ اور دین کے اصل مقاصد ان کی نظروں سے اوجھل تھے۔ صوفیاء کا حال ان سے بھی بدتر تھا۔ وہ سلف کے نام لیوا ضرور تھے، لیکن سلف کی حقیقی روح ان کے تصوف سے غائب تھی ان میں سے ہر ایک اپنے ہی گروہی تصوف کو حرف آخر سمجھتا تھا اور کمال تصوف رہبانیت بنتا جا رہا تھا۔ نجات کے لئے چند وظائف کی تکرار کافی سمجھی جاتی۔ کسی کو معاشرتی و ملکی مسائل سے دلچسپی نہ تھی۔

رموز مملکت خویش خسرواں دانند" کہہ کر وہ اپنے دل کو اطمینان دے لیتے تھے۔ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے تین پائے تھے۔ بادشاہ، اس کے امراء و فوج یعنی حکمراں طبقہ۔ علماء اور صوفیا، علماء قانون اور ایڈمنسٹریشن چلاتے۔ صوفیاء عوام اور حکومت کے درمیان واسطہ تھے اور بادشاہ اور امراء تو حکومت کرتے ہی تھے۔ اسلامی سلطنت کے ان تینوں پایوں کو گھن لگ چکا تھا، اور یہ بتدریج ناکارہ ہو رہے تھے۔ مختصراً یہ کہ ملا طوائف الملوکی کا زمانہ تھا اکبر سے لیکر عالمگیر تک کی بنائی ہوئی یہ وسیع و عریض سلطنت امرا گردی کا شکار ہو رہی تھی۔ ہر امیر اپنی جگہ خود مختار ہونے کی کوشش کرتا۔ اور مرکز سے اس کا تعلق بس برائے نام

تھا، خود مرکز میں حکومت کرنے کی صلاحیتیں ختم ہوچکی تھیں۔ بادشاہ امرا کا قیدی اور ان کی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کا ایک آلۂ کار بن کر رہ گیا تھا۔ غرض برصغیر میں بسنے والے مسلمان خواص و عوام بڑی سرعت سے سیاسی انتشار، معاشرتی خلفشار، معاشی پستی اور اخلاقی و روحانی تباہی کی طرف جا رہے تھے۔ ظاہر ہے شاہ ولی اللہ جیسے صاحب النظر بزرگ ان حالات سے کیسے مطمئن ہو سکتے تھے اور یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ ہر طرف سے مصائب کو یوں امنڈتا ہوا دیکھتے اور ان سے اسلام اور ملت اسلام کو بچانے کے لئے کچھ نہ کرتے انہوں نے سوچا، اور برصغیر کے اُس ماحول میں، اور اُس زمانے میں جس میں کہ شاہ صاحب تھے اس کے علاوہ اور کیا سوچا جاسکتا تھا کہ احمد شاہ ابدالی کو جو مغل سلطنت کے تین صوبوں پنجاب، سندھ اور کشمیر پر قابض تھا۔ دہلی کی طرف کوچ کرنے پر آمادہ کیا جائے، اور اس کی مدد سے برصغیر کے جنوب سے آنے والی مرہٹہ طاقت کو کچلا جائے۔ برصغیر کی گزشتہ تاریخ میں بارہا ہوچکا تھا کہ جب کبھی بھی اس کے مرکز میں مسلمانوں کی حکومت کمزور ہوئی تو شمال سے نئی طاقت اُدھر بڑھی اور اس نے زوال پذیر حکومت کو ہٹا کر خود ایک نئی حکومت کی بنیاد رکھی اس طرح اسلامی سلطنت کو تازہ خون مل جاتا اور برصغیر میں مسلمانوں کا اقتدار بحال ہو جاتا اس دور میں احمد شاہ ابدالی کا قندھار اور لاہور سے چل کر پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کے خلاف صف آرا ہونا کسی غیر ملکی کا ملکی طاقت کے خلاف صف آرا ہونا نہیں تھا۔ وہ دور اور تھا۔ اُس دور میں برصغیر کی سیاسی حدود اور تھیں اور پھر ملکی اور غیر ملکی کے جو تصورات آج ہیں وہ اس دور میں نہیں تھے یہ تو بہرحال دو سو سال قبل کی بات ہے۔ اِس برصغیر میں پچھلے سترہ اٹھارہ سالوں میں ملکی اور غیر ملکی کی تعریف جس طرح بدلی ہے اور اس کے تصورات کیا سے کیا ہو گئے ہیں، وہ آج سب کے سامنے ہے۔

احمد شاہ ابدالی کی مدد سے مرہٹوں کا زور تو ٹوٹ گیا، لیکن بدقسمتی سے دہلی کے اسلامی مرکز میں جان نہ پڑ سکی۔ اور نہ برصغیر میں مسلمانوں کے اقتدار کو تازہ خون مل سکا احمد شاہ واپس چلا گیا اور مغل سلطنت اسی زبوں حالی کا شکار رہی بلکہ اس کی حالت اور بدتر ہو گئی۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا خیال تھا کہ اسلامی ہند کے زوال کا تدارک شمال مغرب کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ اب احمد شاہ ابدالی کے تجربے کی ناکامی کے بعد ان کی توجہ عوام کی طرف ہوئی۔ انہوں نے ایک اصلاحی اسلامی تحریک کی فکری بنیاد رکھی جسے بعد میں ان کے پیروکاروں

نے ایک سیاسی جمعیت کی شکل دی، اور اس نے برصغیر کے شمال مغرب میں جاکر اپنا ایک مرکز بنایا۔ اس مرکز کی پنجاب کی غیر مسلم حکومت کے ساتھ جنگیں ہوئیں۔ اور ایک وقت میں اس کی پشاور میں حکومت بھی قائم ہوگئی۔ لیکن یہ زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوئی، اور بالاکوٹ کے مقام پر ولی اللہٰی تحریک کی ان عملی طاقتوں کو شکست اٹھانی پڑی۔ تاریخ کے ان دو حادثوں میں کتنی عجیب مشابہت ہے کہ جس طرح شاہ ولی اللہ کے پیروکاروں کو سکھ حکومت کے مقابلے میں، جس کے پاس یورپی افسروں کی تربیت یافتہ فوج تھی، بلکہ اس کے بعض سالار اور کمانڈر بھی یورپی فوجی افسر تھے۔ شکست اٹھانی پڑی اسی طرح شیخ محمد بن عبدالوہاب کے پیروکار بھی مصر کے محمد علی پاشا کی فوجوں کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے، جو یورپی افسروں کی تربیت یافتہ تھیں اور رنجیت سنگھ کی سکھ فوجوں کی طرح ان کے بعض اعلیٰ افسر بھی یورپی تھے، اور جزیرۂ عرب میں ان کی حکومت ختم ہوگئی۔ تاآنکہ پہلی جنگ عظیم کے بعد سلطان عبدالعزیز بن سعود اٹھا، اور اس نے اپنے باپ دادوں کی حکومت کو بحال کیا، جو اب سعودی عرب کی صورت میں موجود ہے۔

اس ضمن میں جہاں تک فکر ولی اللہٰی کا تعلق ہے، میرے نزدیک شکستِ بالاکوٹ سے اس کے شکست کھا جانے یا دُور از کار اور غیر موثر ہونے کا نتیجہ نکالنا صحیح نہیں۔ دراصل اس فکر کی اساس پر اُس وقت جو سیاسی جمعیت بنی تھی اس کی بہت سی مجبوریاں تھی اور وہی اس کی ناکامی کا باعث بنیں۔ ایک تو اس سیاسی جمعیت کی قیادت باوجود اپنی تمام روحانی رفعتوں، عقائد کی بلندیوں اور اخلاق و اعمال کی پاکیزگیوں کے ایک زوال پذیر جاگیرداری دور کی پیداوار تھی اور دوسرے اپنے سیاسی مرکز کے لئے جو سرزمین اس نے منتخب کی، اس میں ثبات و استقلال کی قدرتی صلاحیتیں سرے سے مفقود تھیں[1] اور وہاں بیٹھ کر ایک منظم اور با قاعدہ حکومت کا

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ اور ان کے خاندان کے مقابلہ میں امیر معاویہ کی کامیابی کا ایک بڑا سبب عراق کی قبائلی زندگی کی انتشار پسندی کے خلاف شامیوں کی اجتماعیت پسندی اور ان کا فطری ثبات و استقلال تھا۔

مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔ قبائل کی آپس کی منافستیں انہیں ایک عمومی مقصد پر بمشکل ہی جمع ہونے دیتی ہیں۔ ان کی جو حالت ۱۸۳۲ء میں تھی۔ آج بھی کم و بیش ان کی وہی حالت ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسے مقابلہ کرنا پڑا ایک ایسی طاقت کا جو مشینی انقلاب سے آشنا ہو چکی تھی۔ اور مشین جو نظم و ضبط اور ڈسپلن دیتی ہے، اور اس کے استعمال سے ذہن و عمل میں جس قسم کی مستعدی و کارکردگی آتی ہے، اس کا آج ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے۔ سید احمد شہید، شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کے ساتھیوں کی معرکۂ بالاکوٹ میں شکست حقیقت میں اس سماج کی شکست تھی۔ جو اب اس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ ان قوتوں کے مقابلہ کر سکے، جو یورپ کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی انقلاب کے بعد ابھری تھیں۔ اور وہ ایک سیل جرار کی طرح سب کو بہا کر لے جا رہی تھیں۔

اور یوں بھی ایک فکر کی خواہ وہ کتنا بھی عالمگیر کیوں نہ ہو، جب عملی تعبیر ہوتی ہے اور ایک مخصوص زمانے اور ایک مخصوص ماحول میں وہ اساس اور محرک بنتا ہے کسی اجتماعی عمل کا، تو اسے لامحالہ اس زمانے اور ماحول کی بعض باتوں کو اپنانا پڑتا ہے اور سچ پوچھئے تو عمل تو نام ہی ہوتا ہے آئیڈیل اور وقتی حالات و ضروریات کے درمیان مفاہمت کا۔

مرزا غالب نے اسی حقیقت کو شاعری کی زبان میں یوں ادا کیا ہے کہ

ع۔ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

یہ عملی دنیا کی مجبوریاں ہیں اور جو اہل بصیرت ہوتے ہیں، وہ ایک فکر کی عملی تعبیروں میں الجھ کر نہیں رہ جاتے بلکہ ان کی نظریں ان سے گزر کر اصل فکر تک پہنچتی ہیں، اور وہ ہر نئے زمانے میں اس کی نئی تعبیر کرتے اور اسے عمل کے لئے مشعل راہ بناتے ہیں۔ آج ہمارے ہاں بھی اسی کی ضرورت ہے۔ اور ہمیں فکر ولی اللہی کو اسی نظر سے دیکھنا اور اس سے اسی طرح استفادہ کرنا چاہیئے۔

اب میں مختصراً شاہ ولی اللہ کے فکر کے بعض عمومی و عالمگیر پہلوؤں کا ذکر کروں گا، جن کی میرے نزدیک آج بڑی اہمیت ہے۔ اور جن پر ذہنی و عملی دونوں لحاظ سے ہمیں اس وقت زیادہ سے زیادہ زور دینا چاہیئے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ شاہ صاحب ایک مسلم صاحب فکر ہیں، اور ان کا روئے سخن اولاً مسلمانوں ہی سے ہے۔ اب اس بارے میں شاہ صاحب کے فکر کی امتیازی خصوصیت

یہ ہے کہ ان سے پہلے تک مسلمانوں میں فقہ، کلام، تصوف اور مذہبی و سیاسی اختلافات کی وجہ سے جو چھوٹی چھوٹی وحدتیں بن گئی تھیں، اور ان میں باہم مخاصمت پائی جاتی تھی، شاہ صاحب نے ان چھوٹی چھوٹی وحدتوں کو اسلام کی ایک بڑی وحدت کے اندر ہم نوا کرنے کا تصور دیا ہے اور کوشش کی ہے کہ وہ ان کے باہمی تناقضات میں تطبیق دے کر ان سب کو ایک اصل کی فروع یا ایک حقیقت کے مختلف عکس ثابت کریں۔ اور اس طرح ملت اسلامیہ کو وہ وحدت اور سالمیت دیں، جس سے وہ گزشتہ کئی صدیوں سے محروم تھی۔

یہ فکر ولی اللہی کا ایک اہم جزو ہے۔ اور اس فکر کی دوسری امتیازی خصوصیت اس کی نظریۂ وحدت الوجود کی خصوصی تعبیر ہے۔ اس سے ایک تو شاہ صاحب نے روح اور مادہ کی نام نہاد دوئی کو ختم کرنے کی کوشش کی، دوسرے انہوں نے اسے بنیاد بنایا وحدتِ ادیان اور وحدت انسانیت کے تصور کا نیز حکمت یعنی فلسفہ اور نبوت یا حکماء اور انبیاء میں جو مغائرت مانی جاتی ہے۔ اور اور اک حقیقت کے معاملے میں سامی اور آریائی ذہن میں جو اختلاف پایا جاتا ہے، اس کو وحدت الوجود کی اپنی تعبیر سے دور کرنے کی سعی کی۔ شاہ صاحب کے فکر کی تیسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ باوجود ایک عالم، صوفی اور صاحبِ ذکر و فکر ہونے کے انہوں نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ معاشی لحاظ سے ایک حد تک مطمئن معاشرے کے بغیر روحانیت کا حصول ناممکن ہے۔ اور معاشی استحصال بھی ظلم کی ایک صورت ہے اور اللہ تعالیٰ اس قسم کے ظلموں کو ختم کرنے کے لئے نبی مبعوث کرتا رہا ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اُس دور میں ایک فلاحی مملکت کا تصور دیا، لیکن ایسی فلاحی مملکت جو آبادی کی معاشی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ اس کے روحانی تقاضوں کا بھی خیال رکھے۔

میرے نزدیک آج ہمیں فکر ولی اللہی کے ان پہلوؤں کو خاص طور سے اجاگر کرنا چاہیئے، اور انہیں اپنے لئے مشعل راہ بنا کر اس مملکت کی تشکیل نو کی کوشش کرنی چاہیئے۔